مرزا قادیانی اور جماعتِ احمدیہ

کا

”نفسیاتی جائزہ“

تحقیق وتصنیف

سید محمد وقاص

"A Psychological Study of Mirza Qadiyani & Jama'at-e-Ahmadiyyah"

ناشر

باب العلم ریسرچ فاؤنڈیشن

(پاکستان)

Copyright © 2010 by the Author

All rights reserved under the Publishing & Copyright Act

No part of this publication can be copied without a prior permission from the copyright owner in advance.

(Electronic Copy Only)

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں۔

نوٹ: انٹرنیٹ کے لئے موجودہ اشاعت مصنف کی خصوصی اجازت سے کی گئی ہے۔

Bab-ul-Ilm--Always a Step Ahead

Join Us for Excellence

''مرزا قادیانی اور جماعتِ احمدیہ کا نفسیاتی جائزہ''

قادیانیت کا فتنہ جسے قادیانی خود ''جماعتِ احمدیہ'' کا نام دیتے ہیں، اپنے متنازع وجود کے لئے ''مرزا غلام احمد قادیانی'' کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔ مرزا صاحب کی من گھڑت وحی اور اُن کے اسلام دشمن دعوے ہی درحقیقت ''قادیانیت'' کی اصل اساس ہیں۔ لہٰذا قادیانیت کا ہر پہلو سے جائزہ لینے کیلئے یہ بات لازم ہے کہ کسی بھی قسم کے تبصرہ سے پہلے مرزا غلام احمد قادیانی کے دماغ کے اندر کے ماحول کو پہلے تنقیدی انداز میں جانچا اور پرکھا جائے۔ عصرِ حاظر میں Political Psychology کے عنوان کے تحت دنیا کی کچھ بڑی یونیورسٹیاں تاریخ ساز شخصیات اور مشاہیر کے دماغی حالات اور نفسیاتی گردونواح کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایسی ہی ایک تحقیق ''ایڈولف ہٹلر'' پر کی گئی ہے اور اسے "Inside Hitler's Brain" کا نام دیا گیا ہے۔ ایسی تحقیقات بہت سے پہلوؤں سے فائدہ مند ثابت ہو رہی ہیں، جس سے ہم ایسی شخصیات کی نموئی نفسیات، کردار اور حتمی سوچ کے بارے میں بڑی حد تک کامیابی سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اسی طرز پر ایک تحقیق یہاں "Religious Psychology" کے عنوان کے تحت کی جا رہی ہے تا کہ قادیانیت کے بانی کی سوچ اور رویوں کا مطالعہ علمِ نفسیات کی زبان میں کیا جا سکے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کون ہے اور اُس کے کل روحانی نظام کی حقیقت کیا ہے؟ یہ دو بنیادی سوالات ہیں جو ہر قادیانی کو اپنے آپ سے کرنے چاہیں۔ راقم الحروف مکمل وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اگر قادیانی جماعت تمام تعصّبات کو بالائے طاق رکھ کر حقیقت پسندی سے ان دونوں سوالات کا جواب تلاش کرے تو حق اور باطل کا انمٹ فرق اُن پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا۔ بات کو مزید آگے بڑھانے سے پہلے ہم روحانی انقلاب کے دعویداروں کے حوالے سے متعین کردہ قرآنی اصول کو ایک نظر دیکھ لیتے ہیں۔ قرآن فرماتا ہے:

''اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ کا بہتان باندھے یا یہ کہے کی میری طرف (اللہ کی جانب سے) وحی کی گئی ہے، حالانکہ اسکی طرف کچھ بھی وحی نہ کی گئی ہو۔۔۔ آج تمہیں سزا میں ذِلت کا عذاب دیا جائیگا کیونکہ تم اللہ سے ناحق باتیں منسوب کیا کرتے تھے اور تم (درحقیقت) اُسکی آیتوں سے بغاوت کیا کرتے تھے۔''

(سورہ انعام 93:6)

''وحی'' کیا ہے؟ اس کا ماضی میں تصور کیا تھا؟ اور اس کو عصرِ حاضر میں ہم کس معنی میں استعمال کر رہے ہیں؟ یہ سوالات درحقیقت کسی بھی روحانی یا مذہبی فکر کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ لفظِ وحی کے لغوی معنیٰ ''کسی کے دل میں ڈالی گئی بات، اِلقا، انکشاف'' وغیرہ کے ہیں۔ قرآنِ مجید میں یہ لفظ اپنے ماخذ و مصادر اور دیگر صورتوں کیساتھ کم وبیش 83 مرتبہ آیا ہے، اور سبھی جگہوں پر اِس سے مراد ''کسی امر کا اللہ کی جانب سے اپنی مخلوق پر منکشف کیا جانا '' ہے۔ لفظِ وحی پر اس کتاب کے آگے آنے والے ایک باب میں ہر زاویہ سے تفصیلی بحث کی گئی ہے، اور اس ساری تحقیق کے بعد جو بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے، اُسے اگر ایک فقرا میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہو گا کہ وحی ایک ایسا ''امرِ ربی'' ہے جو صرف اللہ کی جانب سے ہوتا ہے اور وحی و نبوت کے کسی بھی دعویدار کے سامنے صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں کہ:

(ا) یا تو اُس پر واقعتاً وحی آتی ہے اور وہ مطلقاً سچا و مخلص ہے۔ اور

(ب) یا پھر وہ اللہ پر جھوٹ کا بہتان باندھ رہا ہے اور لازماً ملعون و کذاب ہے۔

اہلِ دانش جانتے ہیں کہ اِس کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔ اب ہمیں مرزا قادیانی صاحب کے دماغ کے اندر داخل ہونے سے پہلے یہ بات طے کرنا پڑے گی کہ آیا رسول اللہ کی آمد کے بعد وحی کا سلسلہ جاری رہ بھی سکتا ہے یا نہیں؟ اِس سوال پر ہر طرح کی بحث کے لئے قرآن و حدیث ہمارے لئے میزان کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہم انہی دو بنیادی ماخذوں کی روشنی میں ایک دوسرے باب میں سیر حاصل بحث کے بعد یہ ثابت کر چکے ہیں کہ بابِ نبوت کے بند ہو جانے کے بعد ایسا ممکن نہیں۔ اگر کوئی شخص قرآن و حدیث سے باہر کسی اور ماخذ سے یا سائنس اور حواسِ خمسہ کی مدد سے کچھ ثابت کرنا چاہے، تو ایسے دلائل شاید اپنی جگہ پر بے حد مؤثر و مضبوط ہوں، لیکن ان کی کوئی اسلامی حیثیت نہیں ہوگی، اور نہ ہی مسلمانوں پر ایسے دلائل کا قبول کرنا لازم ہوگا۔

وحی چونکہ ایک خالصتاً روحانی معاملہ ہے -- یا جدید خطوط میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک نفسیاتی معاملہ ہے -- اِس لئے اِس معاملے میں جھوٹ بولے جانے کا امکان باقی معاملات کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ یہ جھوٹ یقینی طور پر انسان نفسانی خواہشات کے تابع ہو کر یا شیطان کے زیرِ اثر بولتا ہے۔ چونکہ نفسانی خواہشات بسا اوقات شیطان ہی کے زیرِ اثر فرد کی شخصیت پر غالب آتی ہیں، لہٰذا مرزا صاحب کے قصہءِ نبوت کو کسی طور بھی شیطانی اثرات سے مبرا و مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ درحقیقت یہ قرآن ہی کی بیان کردہ ایک ایسی کیفیت ہے جسے قرآن ''شیطانی وحی'' کا نام دیتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

''اور شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں پر وحی کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم نے اُن کا کہنا مانا تو تم بھی مشرکوں میں سے ہو جاؤ گے۔''

(سورہ انعام 6:122)

لہٰذا ایسا ہر جھوٹ جس میں بیان کردہ بات کے ماخذ کو ''اُلوہی'' قرار دیا جائے، وہ عام جھوٹ کی طرح محض ایک مکروہ ذاتی فعل کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ دورُخی بد دیانتی پر مبنی ایک ناقابلِ معافی دھوکا بن جاتا ہے، کیونکہ جھوٹی وحی کا دعویدار شخص جہاں ایک طرف عامتہ الناس کو دھوکا دے رہا ہوتا ہے، تو وہیں دوسری طرف وہ اللہ تعالیٰ سے جھوٹی بات منسوب کر کے ایک ایسا بہتان ذاتِ باری تعالیٰ پر باندھ دیتا ہے، جس کا کوئی گناہگار سے گناہگار شخص بھی تصور تک نہیں کرسکتا۔ اس لئے نفسیاتی نقطہءِ نگاہ سے بھی یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وحی کے ایسے جھوٹے یا شیطان زدہ شخص کا معاملہ ''ٹیڑھا'' نہیں بلکہ بالکل ''سیدھا'' ہے، کہ ایسا شخص اپنی ذات سے مخلص ہے نہ اپنے ایمان و دین سے، کیونکہ ایسا شخص ''الہام گوئی'' جیسا انتہائی قدم اُٹھانے سے پہلے یا تو کفر و الحاد کی آخری حدیں پار کر کے مذہبی افکار و شعائر سے کھیلنے پر تُلا ہوا ہوتا ہے، یا پھر اُس کے سامنے دنیوی فوائد، دولت اور جاہ و حشمت جیسے دلفریب لالچ ہوتے ہیں، جن کی تڑپ ہمیشہ سے اُس کے دل میں موجزن رہی ہوتی ہے اور وہ موقع ملنے پر اُن کو ہر صورت حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ماضی میں کھڑے ہونے والے نبوت کے جھوٹے دعویداروں کے دماغی مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں عوامل ہی ایسے مکروہ دعوؤں اور الہام گوئی کے معاملات میں کارفرما رہے ہیں۔ نبوت چونکہ ایک اُلوہی فیضان ہے جو منتخب شدہ ایک انسان کو باقی تمام انسانیت سے ممتاز کردیتا ہے اور باقی تمام انسان جن تک اُس کی آواز پہنچے اُس نبی کی پیروی کرنے کے پابند ہوتے ہیں۔ لہٰذہ دولت اور شہرت دونوں ہی ترغیبات ایسے شخص کے لئے بے معنی و بے اثر رہی ہیں جو خدا کی طرف سے مبعوث کردہ ہو۔ البتہ دولت اور شہرت کے پجاری ہر عہد میں کسی نہ کسی ڈھونگ کے ذریعے ان کے حصول کی کوششوں میں مصروف رہے ہیں اور انہی میں سے ایک ڈھونگ نبوت کا بھی ہے، جسے رچا کر چند مفاد پرستوں کی طرف سے لوگوں کو گمراہ کیا جاتا رہا ہے۔

نوعیت کے اعتبار سے زیرِ نظر مطالعہ میں ''عمل وحی'' کا نفسیاتی اور سائنسی تجزیہ بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ وحی کے ساتھ ساتھ ایک اور ایسے لفظ کی وضاحت بھی یہاں ضروری ہوگی، جسے عباسی عہد میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ لفظ ''الہام'' (Intuition) ہے، جس کا کثرت سے استعمال اہلِ تصوف کے ہاں رائج ہے۔ اگرچہ یہ بنیادی طور پر ایک عربی لفظ ہے، لیکن اسلامی فکر کے عراق اور ایران پہنچنے کے بعد اس میں بڑی سرعت سے ''عجمی'' معنی

بھی شامل ہوگئے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ غیر عربی معنوں کا رنگ عربی زبان کے اس لفظ پر ایسا چڑھا کہ اُس وقت کے بعد سے ''الہام'' غیر عربی معنوں میں ہی استعمال ہوتا چلا آ رہا ہے۔اور یہی وہ خرابی ہے جو بہت سی گمراہ کن فکروں کوا تنا راستہ فراہم کر دیتی ہے کہ وہ اسلامی رنگ اختیار کر کے اہلِ اسلام کے لئے گمراہی کا سامان مہیا کر سکیں۔مزید برآں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن نے الہام کا لفظ کہیں بھی وحی کے معنوں میں استعمال نہیں کیا۔

''الہام'' کا لفظ عباسی عہد سے ''کشف'' کے ہم معنی بولا جاتا ہے۔تصوفانہ تحریکوں کے پروان چڑھنے کے بعد کشف والہام کا طریق تصوف کا ایک اہم اصول ٹھہرا۔اس ساری صورتحال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں انتہائی بنیادی سطح پر ایک خطِ امتیاز کھینچنا پڑے گا،جو نفسیاتی اصولوں کے تحت ''وحی'' کو ''الہام'' سے ممیّز وجدا کر سکے۔وحی کی جس واضح ترین شکل سے قرآن مجید انسانیت کو متعارف کرواتا ہے،وہ فرشتوں میں سب سے بلند مرتبہ کے حامل فرشتے ''جبرائیلؑ'' کا اُلوہی پیامبر بن کر انبیاءؑ کی ہستیوں پر نازل ہونا ہے۔اس کے علاوہ قرآن مجید وحی کی کچھ اور صورتیں بھی بیان کرتا ہے۔مثال کے طور پر قرآن ''سورۂ شعراء'' میں وحی کے معاملہ پر یہ مؤقف اختیار کرتا ہے کہ:

''اور کسی بشر کی مجال نہیں کہ اللہ اُس سے کلام کرے، ماسوائے وحی کے ذریعے، یا ایک پردے کے پیچھے سے، یا کسی فرشتے کو نمائندہ بنا کر بھیجے اور وہ اُس کے حکم سے (جو اللہ چاہے) وحی کرے۔پس اس طرح ہم نے آپؐ پر روح (جبرائیل) کو وحی کے ساتھ نازل کیا۔''

(الشعراء 42:91-92)

قرآن مجید کے اس مؤقف سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وحی صرف انبیاءؑ کا ہی خاصہ ہے،اور وحی وصول کرنے والا شخص خدا کے منتخب کردہ نمائندوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔وحی کی جو شکل اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے مخصوص کی وہ اُوپر درج کردہ آیات میں بیان کردہ آخری شکل ہے،جس کے مطابق ''روح القدس''یعنی جبرائیلؑ اللہ تعالیٰ کے حکم سے وحی لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا کرتے تھے۔صحیح بخاری اور دیگر کتبِ صحاح سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا جبرائیل سے پہلی وحی کے موقع پر باقاعدہ مکالمہ ہوا۔اگر ہم اس مکالماتی اندازِ وحی کو سمجھنے کی کوشش ''علمِ نفسیات'' کی مدد سے کریں،تو ہمیں اس کیفیت کی تشریح بڑے نپے تلے الفاظ میں مل جاتی ہے۔ایسے کسی بھی مشاہدے یا تجربے،جس میں کوئی مافوق الفطرتی وجود مکمل شعوری حالت میں نظر آئے،کو نفسیات و مابعدالطبیات کی زبان میں "Neuminous Experience" کہا جاتا ہے۔جبکہ اس کے برعکس ''کشف والہام'' کی کیفیت کو "Intuitive Experience" یا "Mystic Vision" کا نام دیا جاتا ہے۔اور اس طرح علمِ نفسیات کی مدد سے ایک ایسا خطِ امتیاز کھینچ جاتا ہے،جو ''صاحبِ وحی'' کو ''صاحبِ وجدان و عرفان'' سے جدا کر دیتا ہے۔الہامی تجربہ درحقیقت ایک ایسی کیفیت ہے،جس میں سے گزرنے والا انسان ''لاشعور'' (Unconscious) کی گہرائیوں میں حسیات کی قید سے آزاد ہو کر کچھ اس انداز سے اُتر جاتا ہے گویا کہ دنیا و مافیہا اُس کے لئے معنی کھو چکے ہوں۔اس طرح اپنے گردونواح سے ایسا شخص قطعی بے خبر ہو کر خود کو ایک بالکل نئی دنیا میں محسوس کرتا ہے۔روحانیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ الہامی تجربہ بنیادی طور پر ناقابلِ بیان (Ineffable) ہوتا ہے۔اس تجربہ میں سے گزرنے والا شخص اگرچہ اپنی ذات کے اندر تبدیلیاں محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے۔تاہم وہ اسے لفظوں کی لڑی میں پرونے اور خالصتاً انسانی زبان میں بیان کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔کشف والہام کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ اپنی نوعیت میں ایک خالص انسانی تجربہ ہے،جس میں انسان اپنے عقائد کی روشنی میں اپنی ذات کی گہرائیوں سے عرفانی بصیرت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔(واضح رہے کہ یہاں الہام کو وحی کی بجائے اس کے مروجہ کشف کے معنی میں استعمال کیا جا رہا ہے)۔لہٰذا یہ بات انسان کے مجموعی تجربے،جس میں دیگر مذاہب جیسا کہ یہودیت،عیسائیت،ہندومت،بدھ مت،زرتشت مت،روح پرستی وغیرہ کے تجربات ومشاہدات بھی شامل ہیں،کی روشنی میں بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ الہامی،عرفانی یا کشفی تجربات کا کسی مافوق الفطرتی قوت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔اگر خدا نخواستہ کسی طور یہ ثابت ہوجائے کہ عرفانی یا کشفی مشاہدات کا تعلق رحمانی قوتوں بالخصوص اللہ تعالیٰ سے ہے اور انسان ایسے تجربات میں حق تعالیٰ سے ''وحدت'' (Mystic Communion) کے وجدانی اعزاز سے بہرہ ور ہوسکتا ہے،تو نتیجہ کے طور پر وحی اور الہام کا وہ واحد

''معیاری'' (Qualitative) فرق بھی مٹ جائے گا، جس کی بنا پر ہم ایک نبی کی ہستی کو صوفیاء، اولیاء اور عرفانی شیوخ سے ممتاز کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہی وہ اصول ہے جسے بنیاد بنا کر آج امام الانبیاءﷺ کا ہر سچا اُمتی ''ختمِ نبوت'' کا داعی ہے۔ اس معیاری فرق کے مٹ جانے کی صورت میں کوئی بھی زید بکر ماضی میں گزرے صوفیاء، اولیاء اور (شیعہ) آئمہ کو بلاتردّد ہدایتِ ایزدی سے ''براہِ راست'' بہرہ ور اور انبیاءؑ کا ہم پلہ قرار دے سکتا ہے۔

اب تھوڑی سی بات تصویر کے دوسرے رُخ پر بھی کر لیتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر الہام واقعتاً وحی کی ہی ایک قسم ہے تو اس کے اعتراف کی صورت میں کیا کیا اشکالات سامنے آسکتے ہیں۔ اگر ہم ایک لمحے کے لئے الہام کو، جو کہ 'القاء' کے معنی رکھتا ہے، وحی کی ایک قسم مان لیں تو ایسی صورت میں ہم پر یہ ماننا بھی لازم ہو جائے گا کہ دنیا کے ہر انسان کے ذہن میں آنے والا ہر خیال خدائے عزّ وجل کی طرف سے الہام یعنی القاء ہے۔ کیونکہ بحیثیتِ مسلمان ہمارا اس بات پر نا قابلِ تغیر ایمان ہے کہ زمین پر پتّا تک بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر نہیں ہلتا، چنانچہ یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان جو کہ ذی شعور اور اشرف المخلوقات ہے کے ذہن میں کوئی بات تائید و حکمِ ایزدی کے بغیر آ جائے؟

الہام کے موضوع پر دوسرا اشکال یہ سامنے آتا ہے کہ اگر الہام کو وحی کا ہم سر مان لیا جائے اور خدا و انسان کے مابین ذاتی سطح پر کسی بھی ایسے الہامی یا کشفی ''ابلاغ'' (Communication) کو تسلیم کر لیا جائے، جس میں محرک و ماخذ حق تعالیٰ کی ذات کو ٹھہرایا جائے، تو ہمیں بادلِ نخواستہ صوفیاء کی ایک لمبی فہرست کو بھی نبی ماننا پڑے گا۔ روحانی اور وجدانی سلسلوں میں ایسے ابلاغ کی داستانیں اکثر ''ہاتفِ غیبی'' کی صورت میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں، اور یہ سلسلہ بھی آسمان و زمین کے باسیوں کے درمیان کلام و ابلاغ کی ایک ایسی پختہ شکل اختیار کر چکا ہے، جو نہ صرف وحی جیسے خواص رکھتا ہے، بلکہ اس میں کلام کرنے والی غیبی قوت معروف اور انسان مجہول کی حیثیت سے شامل ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں، جو تیسرا مسئلہ اس معاملہ میں درپیش ہو سکتا ہے، وہ عملِ الہام میں شیطان کا کردار ہے۔ قرآن مجید نے شیطان کے مختلف کرداروں میں سے دو کردار ''وسوسے ڈالنے والا اور گمراہ کرنے والا'' بھی بیان کئے ہیں۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ کوئی الہام جو کہ اپنی نوعیت میں وحی سے قریبی مماثلت رکھتا ہو، شیطان کی طرف سے کسی آدمی کو گمراہ کرنے کے لئے کیا جائے اور وہ شخص اپنی ناسمجھی میں اس شیطانی وسوسہ کو پیغامِ خدائے قدوس سمجھ بیٹھے اور فوراً منادی کرا دے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر ہے۔ یہ لازم نہیں کہ شیطان خود ہی یہ کام سر انجام دے، بلکہ وہ اپنے زیرِ اثر دیگر شیطانی قوتوں، جنہیں مجموعی طور پر ''حزبِ شیطان'' کہنا انتہائی موزوں ہوگا، کے ذریعے بھی یہ کام کروا سکتا ہے۔ اس بات کی تصدیق کے لئے کچھ اہم مثالیں ہمیں ظہورِ اسلام سے قبل کے عرب معاشرے سے بھی مل سکتی ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب معاشرے میں ''کاہن'' (Oracle) اور ''شاعر'' (Poet) کا کردار بے حد اہم اور معنی خیز ہوا کرتا تھا۔ کاہن کا فریضہ دنیا بھر کے مذاہب کی طرح عربوں کے ہاں بھی پیش گوئی کرنا اور آسمانی قوتوں کے ساتھ انسانوں کے روابط قائم کرنا ہوا کرتا تھا۔ قرآن مجید نے بھی کاہن کے اس کردار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تاہم اسلام نے کاہنوں کے پُراسرار الہامات اور معلومات کے ماخذ کو شیطانی قرار دے کر کہانت کو انسانی معاشرے کے صحت مند ارتقاء کے لئے مضر قرار دیا ہے۔ کہانت کی اس وضاحت کے موقع پر یہاں ایک سوال کا اُٹھایا جانا انتہائی برمحل معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس سوال کا تعلق جھوٹے نبیوں کے پیش کردہ کچھ اہم دلائل سے ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر محض پیش گوئیاں کرنا اور اُن میں سے کچھ کا پورا ہو جانا کسی مدعیءِ نبوت کی حقانیت کی دلیل ہے تو کہانت کا پیشہ اختیار کرنے والے لوگ نبوت کے زیادہ حق دار ٹھہرتے ہیں اور اُنہیں کاہن کی بجائے نبی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کیونکہ ایسی صورتحال میں ایک کاہن سے زیادہ کوئی اور نبوت کے چند دعویداروں کی طرف سے پیش کردہ اس معیار پر پورا نہیں اُتر سکتا۔

''جماعتِ احمدیہ'' جو کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اُن کے خلفاء کی پیشگوئیوں کے بلند بانگ دعووں پر مسیحیت، نبوت، رسالت اور خلافت کے محلات تعمیر کئے ہوئے ہے، کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ سولہویں صدی عیسوی کے فرانسیسی کاہن ''ناسٹرڈیمس'' کی پیشگوئیاں مرزا صاحب کی پیشگوئیوں سے نہ صرف بیسیوں گنا زیادہ ہیں، بلکہ اُن میں سے بیشتر لفظ بلفظ پوری بھی ہو چکی ہیں۔ ناسٹراڈیمس انتہائی واضح الفاظ استعمال کرنے اور آنے والے زمانوں میں جلوہ گر ہونے والی اہم عالمی شخصیات کے نام لے کر پیشگوئیاں کرنے میں بیمثال شہرت رکھتا ہے۔ ناسٹراڈیمس کی اِس

شہرت کو عصرِ حاضر میں اُس پر ہونے والی تحقیق نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ پیشگوئیوں کے مطالعہ کاروں کا کہنا ہے کہ ناسٹراڈیمس سولھویں صدی کے بعد وقوع پذیر ہونے والے لگ بھگ ہر اہم عالمی واقعہ کے متعلق قبل از وقت پیش گوئی کر چکا ہے۔ اُس کی پوری ہونے والی چند اہم پیشگوئیوں میں ''لندن کی عظیم آگ (1666ء)، نپولین بوناپارٹ کی فرانس میں بادشاہت، ہٹلر کا ظہور و عروج، پہلی اور دوسری جنگِ عظیم، جان ایف کینیڈی کا قتل اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ٹاوروں کی تباہی'' کی پیشگوئیاں قابلِ ذکر ہیں۔ ان پیشگوئیوں کی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ناسٹراڈیمس اپنے قطعوں میں اس قدر واضح الفاظ میں تفصیلات فراہم کرتا ہے کہ کہیں بھی علامتی تشریحات کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اس موقع پر ہر قاری یہ سلگتا ہوا سوال اُٹھانے میں حق بجانب ہے کہ آخر وہ کون سا کیفیتی و معیاری پیمانہ (Qualitative Standard) ہے، جس کی بنیاد پر ہم مرزا صاحب کے ماخذِ علم کو ناسٹراڈیمس کے ماخذِ علم سے برتر یا مرزا صاحب کے ذریعہ علم کو ''رحمانی'' اور ناسٹراڈیمس کے ذریعہء علم کو ''شیطانی'' قرار دے سکتے ہیں؟ وہ کون سی ایسی کسوٹی ہوگی جس کے ذریعے ہم سبھی کاہنوں کو جھوٹا ثابت کرنے کے بعد اچانک ایک ایسے شخص کو سچا قرار دے دیں گے جو اپنے دعووں کی تصدیق کے لئے غیر جانبدارانہ طور پر مصدقہ شواہد پیش کرنے سے قاصر ہو؟ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ایک ایسا شخص ہو جس کی طرف سے اپنی نبوت کی حقانیت کا معیار بنائی گئی واحد پیشگوئی کبھی پوری ہی نہ ہوئی ہو۔1

"Inside Mirza's Mind" کے اس مرحلہ پر ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ داستانِ الہام گوئی کی ابتداء کہاں سے ہوئی اور وہ کون سے ایسے عوامل تھے جنہوں نے اس خاردار پودے کی آبیاری کر کے اس کو تناور درخت بنایا۔ تاریخ کا ہلکا سا بھی ادراک رکھنے والے لوگ اس بات سے بخوبی واقف ہوں گے کہ اُنیسویں صدی شورشوں سے بھرپور اور دُوررس نتائج کی حامل تبدیلیوں والی صدی تھی، جس نے انسانی معاشرت پر گہرے نقوش چھوڑے۔ اس صدی میں بنی نوع انسان نے عالمگیر پیمانے پر اپنے طرزِ زندگی کو تبدیل ہوتے اور معاشروں کو نئے روپ دھارتے دیکھا۔ یورپی معاشرہ جو ابھی Age of Reason سے نکلا ہی تھا، اب سائنس کی بھول بھلیوں میں پھنس گیا۔ عقل پرستوں، ارتقاء کے پجاریوں اور دیگر سائنسی مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے سرزمینِ یورپ پر لادینی اور بے چینی اس قدر شدت سے پھیلا دی کہ مغرب کا انسان اپنے ہی ماضی سے ناطہ توڑنے پر تُل گیا۔ یہ اثرات گو جلد ہی انگریزوں کی موجودگی کی وجہ سے برصغیر پر پڑنا شروع ہو گئے تھے، تاہم 1857ء کی جنگِ آزادی اس سارے عمل کی نسبت ایک اہم واقعہ قرار دیا جا سکتا ہے، جس نے اہلِ برصغیر کے لئے ایک یکسر نیا نظامِ حیات تشکیل دے ڈالا۔ درحقیقت 1857ء کی جنگِ آزادی نے مسلمانوں کو نفسیاتی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا تھا، کیونکہ وہ اپنی تاریخ میں کبھی بھی غلامی کے طوق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں رہے تھے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اب وہ آقا نہیں رہے تھے بلکہ غلام بنائے جا چکے تھے۔ ہندوؤں کا معاملہ مسلمانوں سے قطعی مختلف تھا، کیونکہ مسلمانوں کی شکست اور عنانِ حکومت پر انگریز کے قبضے کا ہندوؤں کے نزدیک مطلب محض ''آقا کی تبدیلی'' تھا۔ وہ پہلے بھی رعایا تھے اور اب بھی رعایا ہی رہنے والے تھے۔ ایک ہزار سالہ غلامی نے اُن کے ذہن کو غلامانہ اور نفسیات کو شاطرانہ بنا دیا تھا۔ اُنہیں غلامی کی عادت ہو چکی تھی اور وہ کسی بھی چھوٹی یا بڑی تبدیلی کو قبول کرنے کے لئے مسلمانوں کی نسبت کئی گنا زیادہ تیار تھے۔ مسلمانوں کے لئے یہ بات ایک المیہ (Tragedy) سے کم نہیں تھی کہ وہ ایک ہزار سال تک حکمران رہنے کے بعد اچانک غلام بن گئے تھے۔ انگریز بھی چونکہ یہ جانتے تھے کہ مسلمان برصغیر کے سیاہ و سفید کے مالک رہ چکے ہیں، چنانچہ جنگ کے بعد یہ صرف مسلمان ہی تھے جو اُن کے زیرِ عتاب آئے اور ہندو بڑی مکاری سے اس حساس صورتحال سے بچ نکلے۔ انگریزوں کی انتقامی کاروائیوں کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ برصغیر کے طول و عرض میں رہنے والے مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس گہرا ہوتا چلا گیا۔ دوسرے لفظوں میں جنگِ آزادی کے بعد کا زمانہ مسلمانوں کے لئے حسرت و یاس اور مایوسی کا زمانہ تھا۔ مسلمان مالی، سیاسی، تعلیمی اور نفسیاتی لحاظ سے انتہائی کسمپرسی کا شکار تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنہیں اب کسی ''مسیحا'' کی تلاش تھی، جو اُنہیں مشکلات اور آزمائشوں کے اس دور سے بحفاظت نکال کر اُن کی اُس منزل تک پہنچائے جس کا اسلام نے ہمیشہ مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے۔ مسلمانوں کی فکری و عملی نشاۃ ثانیہ کے لئے اُٹھنے والی ہر آواز درحقیقت اسلام کے نام پر دائرۂ اسلام کے اندر سے ہی اُٹھنے والی تھی۔ لہٰذا مسلمانانِ برصغیر اپنی عظمتِ رفتہ کی بحالی اور اسلام

کی سربلندی کے لئے بلند کی جانے والی ہر آواز پر، قطع نظر اس کے کہ اُس کے پیچھے کیا مقاصد کارفرما تھے، لبیک کہتے چلے گئے۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے اس معروضی صورتحال کا مکمل فائدہ اُٹھایا اور خود کو مسلمانوں کا محض ''مسیحا'' بنا کر پیش کرنے کی بجائے حالات کو سازگار سمجھتے ہوئے سچ مُچ کا ''مسیح'' بنا کر پیش کر دیا۔ اُن کے بقول یہ کوئی عام مجدد، مسیحا یا رہنما نہیں تھا، بلکہ وہ مسیح تھا جو قریباً دو ہزار سال قبل مبعوث کیا گیا تھا اور اُس کا یہ دوسرا جنم تھا جسے مرزا صاحب اپنی اصطلاح میں ''مسیح موعود'' (The Promised Messiah) کا نام دیتے ہیں۔ مرزا صاحب کی یہ تحریک انگریزی حکومت کی منشاء کے عین مطابق تھی، لہٰذا انگریزی سرکار نے اس تحریک کو پروان چڑھانے کے لئے ہر طرح سے حالات کو سازگار بنائے رکھا۔ یقیناً یہی وجہ تھی کہ خود مرزا صاحب نے اپنی تحریک کے پھلنے پھولنے میں انگریزی سرکار کے کلیدی کردار کا اعتراف کرتے ہوئے قادیان میں جنم لینے والے مکتبہءِ فکر کو ''انگریز کا خود کاشتہ پودا'' قرار دیا۔ 2

اس موقع پر حقیقت کو افسانہ سے جدا کرنے کے لئے ہم پر یہ لازم ہے کہ ذاتی تعصب سے بالاتر ہو کر تحقیق کی روح کو قائم رکھا جائے۔ چنانچہ اس معیار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ ابتداء میں مرزا صاحب نے جب اسلام کی بات کی اور اُس کی دیگر ہندوستانی مذاہب کے مقابلے میں سربلندی کا نعرہ لگایا تو وہ بڑی حد تک اپنے مقصد سے مخلص تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اپنی ذات، مقصد اور طریق سے خلوص وہ اہم عنصر ہے جو کسی فکر، دعوت یا تحریک کی سچائی کی بنیاد ہے۔ اس لئے یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ ''براہینِ احمدیہ'' کو لکھنے کا ارادہ خلوص نیت سے اسلام کی سربلندی اور محمد ﷺ پر رسالت و نبوت کے ابواب قطعی انداز میں بند ہو جانے کو ثابت کرنے کے لئے کیا گیا تھا اور مرزا صاحب کی منشاء یہ تھی کہ ایسے دلائل و براہین مہیا کئے جائیں جن سے دیگر مذاہب کے ماننے والے بالخصوص ہندو اور عیسائی اسلام کی حکانیت کے قائل ہو جائیں۔ تاہم چیزیں ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتیں، کیونکہ کسی کے خلوص اور کام کے معیار کا فیصلہ وقت از خود کرتا ہے۔

اگر مرزا صاحب کی سوانح حیات کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو تنہائی اور خوش عقیدگی ہر اہم مرحلے پر نظر آتے ہیں۔ معروف ماہر نفسیات ''کارل گستاؤ ژنگ'' ایسی خصوصیات کے حامل کردار کو ''اندروں بیں'' (Introvert) شخصیت کا نام دیتے ہیں۔ اندروں بیں شخص دنیا کی رنگینی اور تیز رفتار زندگی سے بھاگ کر کسی تنہا گوشے میں پناہ لیتا ہے اور حقیقت کی بجائے تخیل کی دنیا میں جینے کو ترجیح دیتا ہے۔ مسلسل ایسی حالت میں رہنے کی وجہ سے اُسے تخیلات اور ظنی شبہات حقیقت کے بہت قریب لگنے لگتے ہیں اور انسان اس کیفیت کے اندر دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ بالآخر وہ ایک مرحلے پر ''سرابِ ذہنی'' (Hallucination) کا شکار ہو جاتا ہے، اور اُسے جاگتی آنکھوں سے واہمے ہونے لگ پڑتے ہیں۔ ایسی کیفیت اور اس کے اثرات پر مستند نفسیاتی تجربات اور تفصیلی مطالعے موجود ہیں۔ یہ کیفیت مرزا صاحب کی جوانی کے زمانہ میں بڑی آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ مرزا صاحب کی زندگی سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ اُن کو اکثر ''ہسٹریا'' (Hysteria) کا دورہ پڑتا تھا اور اُن کی ذہنی کیفیت غیر متوازن ہو جایا کرتی تھی۔ 3 ہسٹریا کے دوروں کی تصدیق ''سیرت مہدی'' کے مصنف مرزا بشیر احمد بھی کرتے ہیں، اور ہسٹریا کے ساتھ ساتھ عقل کو گمراہ کر دینے والی بیماری ''مراق'' (Melancholia) کی مرزا صاحب میں موجودگی کا اقرار بھی کرتے ہیں۔ 4 اسی قسم کی ایک اور مثال موجودہ مؤقف کی تائید میں مرزا صاحب کی اپنی تحریر سے دی جا سکتی ہے، جس میں وہ اپنے مسلسل روزہ کی حالت میں رہنے، اس کے اثرات و برکات اور اپنی باطنی صلاحیتوں کا تذکرہ بڑی شد و مد سے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تاہم کوئی بھی ماہر نفسیات اس تحریر کے مطالعہ کے بعد اُن کی روحانی کیفیت کو یقینی طور پر Hallucination کی مکمل ترین شکل قرار دے گا۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں:

''اس قسم کے روزہ کے عجائبات میں سے جو میرے تجربہ میں آئے وہ لطیف مکاشفات ہیں جو اس زمانہ میں میرے پر کھلے۔ چنانچہ بعض گذشتہ نبیوں کی ملاقاتیں ہوئیں، اور جو اعلیٰ طبقہ کے اولیاء اس اُمت میں گذر چکے ہیں اُن سے ملاقات ہوئی۔ ایک دفعہ عین بیداری کی حالت میں جناب رسول اللہ ﷺ معہ حسنین و علی و فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دیکھا اور یہ خواب نہ تھا بلکہ بیداری کی ایک قسم تھی۔ غرض اسی طرح کئی مقدس لوگوں کی ملاقاتیں ہوئیں۔ جن کا

ذکر کرنا موجبِ تطویل ہے اور علاوہ اس کے انوارِ روحانی تمثیلی طور پر برنگ ستون سبز و سرخ ایسے دلکش و دلستان طور پر نظر آتے تھے جن کا بیان کرنا بالکل طاقتِ تحریر سے باہر ہے۔''

(کتاب البریہ، حاشیہ صفحات 198-197)

اگر مرزا صاحب آج کے زمانہ میں زندہ ہوتے تو شاید خود ہی کسی اچھے ماہر نفسیات (Psychiatrist) سے اپنا علاج کروانے کی فکر کرتے۔تاہم یہ امرِ بدقسمتی ہے کہ مرزا صاحب کے دور میں اچھے ماہر نفسیات تو دور کی بات، ابھی علم نفسیات کی بحیثیتِ ''علم'' (Science) کوئی پختہ شکل بھی سامنے نہ آپائی تھی۔ اُس دور میں نفسیات کا مطالعہ و کردار اکتسابی حوالے سے ابھی خود نوزائیدہ تھا۔

جیسا کہ ہم نے اُوپر مرزا صاحب کی طبیعت کو ژنگ کی بیان کردہ ''اندروں بیں شخصیت'' کی ایک مکمل شکل قرار دیا ہے، لہٰذا ہمارے مؤقف کی تائید میں مؤرخ احمدیت جناب دوست محمد شاہد کی درج ذیل شہادت ایک بہترین ''برہان'' ثابت ہوگی، جو یقینی طور پر اس تاثر کو ختم کر دے گی کہ شاید راقم الحروف کی طرف سے کسی قسم کے تعصب کا مظاہرہ کیا جارہا ہے۔مولانا دوست محمد شاہد اپنی کتاب ''سوانح حضرت مسیح موعود'' میں لکھتے ہیں:

''حضرتِ اقدس علیہ السلام کو ابتداء ہی سے جنابِ الٰہی سے ایسا جذب عطا ہوا کہ آپ شروع ہی سے خلوت نشین ہو گئے تھے۔''5

اسی طرح مرزا صاحب کی اندروں بینی اور تیز رفتار معاشرتی زندگی سے دور بھاگنے کی ایک واضح شہادت مرزا صاحب کی اپنی تحریر میں موجود ہے۔وہ فرماتے ہیں:

''والد صاحب موصوف نے زمینداری امور کی نگرانی میں مجھے لگا دیا۔میں اس طبیعت اور فطرت کا آدمی نہ تھا۔اسی لئے اکثر والد صاحب کی ناراضگی کا نشانہ رہتا۔۔۔میری طبیعت اس طریق سے سخت بیزار تھی۔''

(کتاب البریہ، صفحہ 151)

مرزا صاحب اپنی تحریروں میں دُنیوی معاملات پر بات کرتے ہوئے کثرت سے لفظ ''کراہت'' استعمال کرتے ہیں، جس سے اُن کی منشاء اس بات کا اظہار ہے کہ وہ دُنیوی امور سے بیزاری اور دینی امور سے گہری رغبت رکھتے تھے۔ حالانکہ معاملہ ایسا نہیں۔دراصل حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے، جس کا علم خود مرزا صاحب کو بھی نہیں تھا۔اس پورے عمل کو ہم ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔اندروں بیں شخصیت کا مالک فرد جب رنگ برنگی بیرونی (External) دنیا میں خود کو گھرا ہوا پاتا ہے، تو وہ خود کو ایک ایسے زخمی سپاہی کی مانند خیال کرتا ہے جو میدانِ جنگ میں اچانک دشمنوں کے نرغے میں آگیا ہو۔اُس کی بے چینی کی کیفیت بالکل ویسی ہی ہوتی ہے، جیسی کیفیت حالتِ نزاع میں انسان پر طاری ہوتی ہے۔تاہم جب وہ واپس اپنی خلوت میں پہنچ جاتا ہے، جو کہ اُس کی اپنی تعمیر کردہ ایک تخیلاتی دنیا ہوتی ہے، تو وہاں اُسے ایسا سکون مل جاتا ہے گویا کہ زخمی سپاہی دشمنوں کے نرغے سے بچ کر کسی نہ کسی طرح مضبوط فصیل والے قلعے میں پہنچ گیا ہو۔اُس کے اردگرد موجود تنہائی کا مضبوط حصار اُس کو اپنی رعایا سا معلوم ہوتا ہے اور وہ فرد خود وہاں کا مطلق العنان بادشاہ ہوتا ہے۔اس کیفیت سے عموماً دو طرح کے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔(ا) یا تو انسان اپنی پرستش شروع کر دیتا ہے اور جذباتی مسئلہ ''نرگسیت'' (Narcissism) میں مبتلا ہو جاتا ہے۔یا پھر (ب) وہ کچھ مخصوص نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتا ہے جو آگے چل کر نفسیاتی بیماریوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ہم ان مسائل کا تذکرہ آنے والے صفحات میں کریں گے۔

اپنی طبیعت اور بیرونی دنیا کے درمیان پائی جانے والی کشمکش سے انسان کی سوچنے کی حس بے حد متاثر ہوتی ہے۔جدید نفسیات میں ایسی کیفیت کے لئے ایک خاص اصطلاح ''گریز گریزِ کشمکش'' (Avoidance Avoidance Conflict) استعمال کی جاتی ہے۔یہ کشمکش تب پیدا ہوتی ہے جب انسان دو باہم مختلف ناپسندیدہ امور میں پھنس جاتا ہے اور اُس کو کم از کم ایک ناپسندیدہ عمل ہر صورت اختیار کرنا پڑتا ہے۔اُس کو ایک عمل اس لئے بھی اختیار کرنا ہوتا ہے کیونکہ ایسا کر کے وہ دوسرے ناپسندیدہ عمل، جو کہ بالواسطہ طور پر پہلے کا نتیجہ ہوتا ہے، سے بچ سکتا ہے۔اور اگر وہ پہلے عمل کو اختیار نہیں کرتا تو

نتیجہ کے طور پر دُوسرا ناپسندیدہ عمل وقوع پذیر ہو جاتا ہے، جو اپنے اندر پہلے عمل کی نسبت زیادہ شدت رکھتا ہے۔ اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ ایک بچہ گرمیوں میں دوپہر کو سونا نہیں چاہتا، کیونکہ دن میں سونا اس کے لئے ایک ناپسندیدہ عمل ہے۔ اس کی بجائے وہ دوپہر کے وقت کھیلنے کو پسند کرتا ہے۔ لیکن اس ناپسندیدگی کے باوجود وہ دن کے سونے کا جھنجھٹ محض اس لئے برداشت کر لیتا ہے کہ اگر اُس نے آرام نہ کیا تو والدین کی ڈانٹ ڈپٹ یا سزا کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، جو کہ اُس کے لئے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ لہٰذا وہ ایک بڑی کشمکش سے بچنے کے لئے ایک چھوٹی کشمکش قبول کر لیتا ہے۔

اس قسم کی کشمکش کی کئی ایک مثالیں مرزا صاحب کے دورِ جوانی سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ یہ دور اس لئے بھی اہم ہے کہ ابھی اُن کے سر پر والد صاحب کا سایہ موجود تھا اور اُن کی شخصیت تعمیر و ارتقاء کے مراحل میں تھی۔ نفسیاتی اعتبار سے انسان کے اکثر مسائل اسی دور میں نفسیاتی بیماریوں کی شکل اختیار کرتے ہیں، جبکہ مزاج اور عادات بھی عمر کے اس مرحلے تک پختہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ مرزا صاحب ''کتاب البریہ'' میں لکھتے ہیں:

''اُن (والد صاحب) کی ہمدردی اور مہربانی میرے پر نہایت درجہ پر تھی۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ دُنیاداروں کی طرح مجھے رُوبہ خلق بنا دیں اور میری طبیعت اس طریق سے سخت بیزار تھی۔ ایک مرتبہ ایک صاحب کمشنر نے قادیان میں آنا چاہا۔ میرے والد صاحب نے بار بار مجھ کو کہا کہ پیشوائی کے لئے دو تین کوس جانا چاہیے، مگر میری طبیعت نے نہایت ''کراہت'' کی اور میں بیمار بھی تھا اس لئے نہ جاسکا۔ پس یہ امر بھی اُن کی ناراضگی کا موجب ہوا۔ اور وہ چاہتے تھے کہ میں دُنیوی امور میں ہر دم غرق رہوں، جو مجھ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر تاہم میں خیال کرتا ہوں کہ میں نے نیک نیتی سے، نہ دنیا کے لئے، بلکہ ثوابِ اطاعت حاصل کرنے کے لئے اپنے والد صاحب کی خدمت میں اپنے تئیں محو کر دیا تھا، اور اُن کے لئے دعا میں بھی مشغول رہتا تھا۔''

(کتاب البریہ، صفحہ 195-182 حاشیہ)

گویا کہ مرزا صاحب اپنی طبیعت کی ''کراہت'' کی وجہ سے اپنے والدِ محترم کے احکامات بجالانے کی بجائے عدم فرمانبرداری کے ناپسندیدہ عنصر کو قبول کر لیتے، اور اس کا ازالہ والد صاحب کے لئے دعا کر کے اور کبھی کبھی اُن کی خدمت کر کے کیا کرتے۔ مرزا صاحب مذکورہ بالا کتاب میں چند سطور آگے چل کر اپنی سرکاری نوکری کے متعلق بیان کرتے ہیں:

''ایسا ہی اُن کے زیرِ سایہ ہونے کے ایام میں چند سال تک میری عمر کراہت طبع کے ساتھ انگریزی ملازمت میں بسر ہوئی۔ آخر چونکہ میرا جدا رہنا میرے والد صاحب پر بہت گراں تھا، اس لئے اُن کے حکم سے جو عین میری منشاء کے موافق تھا، میں نے استعفاء دے کر اپنے تئیں اس نوکری سے جو میری طبیعت سے مخالف تھی سبکدوش کر دیا۔ اور پھر والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔''

یہاں چونکہ حکم طبیعت کے ''موافق'' تھا اور مرزا صاحب چونکہ پہلے ہی گھر کے لئے اُداسی (Nostalgia) کے ہاتھوں عاجز آ چکے تھے، لہٰذا فوراً استعفیٰ دے کر گھر پہنچے، جس سے اُن کی اندروں بیں شخصیت کو قرار سا آ گیا۔ مزید برآں، مرزا صاحب نے آنے والے اپنے مسیحائی دور میں جب یہ کتاب لکھ کر اپنے خاندانی حالات بیان کیئے، تو اپنے رُفقاء کو مزید قائل و مطمئن کرنے کے لئے اپنے نوکری چھوڑنے کے متعلق یہ انتہائی متاثر کن جواز پیش کیا کہ ''اِس تجربہ سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ اکثر نوکری پیشہ نہایت گندی زندگی بسر کرتے ہیں۔''

مرزا قادیانی صاحب کی طبیعت میں موجود کراہتِ دُنیوی کی ان مثالوں اور اُن کے بحیثیتِ مہدی و مسیح کردار میں باہم کتنی عدم مطابقت موجود ہے ، اس کی وضاحت کے لئے ہم مرزا صاحب کے دورِ جوانی کو رسول اللہ ﷺ کے دورِ جوانی کی روشنی میں تنقیدی اصولوں کے تحت زیرِ مطالعہ لا کر غیر متعصّبانہ نتائج تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس موقع پر راقم الحروف کا بحیثیتِ محقق کسی اور شخص یا مضمون سے نہیں، بلکہ از خود تاریخ سے یہ سوال ہے کہ کیا رسولِ عربی ﷺ نے بھی اپنے دورِ جوانی یا بعثت سے پہلے کے زمانہ میں کسی قسم کی ''کراہتِ دُنیوی'' کا اظہار کیا تھا؟ بلاشبہ تاریخ کا جواب ''نفی'' میں ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ 25 سال کے عہدِ شباب تک آپ ﷺ کی شہرت مکہ جیسے میٹرو پولیٹن شہر اور اس کے گرد و نواح میں ایک انتہائی ایماندار، باوقار اور منجھے ہوئے تاجر کی حیثیت سے پھیل چکی تھی۔ یہی وہ وجہ تھی کہ جس نے شہرِ مکہ کی سب سے مالدار خاتون خدیجہؓ بنتِ خویلد کو آپ ﷺ کی خدمات لینے اور بالآخر شادی کی

درخواست کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہ ایک ناقابل تردید معاشیاتی حقیقت ہے کہ ایک کامیاب کاروباری آدمی بالخصوص تاجر بننے کے لئے کئی سال کا تجارتی تجربہ اور کاروباری پس منظر درکار ہوتا ہے، کیونکہ یہ اقتصادی کامیابی کے دو اہم زینے ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی میں قصیٰ بن کلاب کی قائم کردہ روایت کے مطابق دو تجارتی کارواں شام اور یمن کی طرف روانہ کئے جاتے تھے، اور مکہ کا ہر اہم تاجر مجموعی طور پر سال کا نصف کے قریب حصہ مکہ سے باہر ہی گزار دیا کرتا تھا۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا مالِ تجارت شام لے کر جانے کے وقت تک رسول اللہ ﷺ یقیناً کئی تجارتی قافلے اپنے چچا ابو طالب کی زیرِ نگرانی یا اپنی ذاتی سرکردگی میں لے جا چکے تھے، اور قریشِ مکہ کو بارہا کثیر فائدہ پہنچا چکے تھے۔ پس آپ ﷺ کے اس طریق سے یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے عہدِ نوجوانی سے اُدھیڑ عمری کے آغاز تک ایک انتہائی متحرک کاروباری اور سماجی زندگی بسر کی۔ جبکہ آپ ﷺ کا عہدِ نبوت اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ آپ ﷺ محض داعیءِ حق ہی نہ تھے، بلکہ اسلامی ضابطہءِ حیات کے ''اُسوۂ کامل'' بھی تھے۔ آپ ﷺ نے سیاست و عدالت سمیت زندگی کے ہر پہلو میں انتہائی باوقار اور عملی زندگی گزاری۔ آپ ﷺ کی نبوت سے پہلے کی بھرپور سماجی زندگی کے اور بھی بے شمار واقعات تاریخ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، جو آپ ﷺ کو مکہ کی انتہائی معروف اور مؤثر شخصیت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اِنہی واقعات میں سے ایک شہرۂ آفاق واقعہ تعمیرِ کعبہ کے بعد حجرِ اسود کی تنصیب (606ء) کا ہے، جو آپ ﷺ کی سماجی فراست کا عظیم ثبوت ہے، کیونکہ یہ آپ ﷺ کا ہی مدبرانہ فیصلہ تھا جس نے اہلِ مکہ کو ہولناک خانہ جنگی سے بچا لیا۔

اس کے برعکس مرزا صاحب کی شخصیت سُست مزاج، سہل پسند، آنسی اور تنہائی پرست نظر آتی ہے۔ یہاں اگر رسول اللہ ﷺ کی ہستی اور کردار کو معیارِ نبوت کے طور پر لیا جائے، تو کیا غیر تشریعی اور ظلی و بروزی نبوت، مسیحیت اور مہدیت کو اپنی ذات میں ضم کرنے والا شخص اس کسوٹی کے کہیں دُور سے بھی گزرتا ہوا نظر آتا ہے؟ مرزا صاحب کے پیروکار لاکھ اس بات کے دلائل دیں اور کثیر اسلوبی ذرائع سے استدلال کر کے ثابت کرنا چاہیں کہ مرزا صاحب کا اندازِ حیات درحقیقت نبوت کی مجموعی تحریک کے اندر ایک نئے مزاج کا ارتقاء ہے۔ لیکن یہ استدلال اور دلائل ہر ایسی بحث میں غیر مؤثر، بلکہ باطل ثابت ہوں گے جو قرآن کریم اور سیرتِ طیبہؐ کو اساس بنا کر کی جائے گی۔ انسان کی مذہبی تاریخ میں معلوم کسی بھی نبیؑ کے حالات کبھی ایسے نہیں رہے، جو مرزا صاحب کے ''کراہتِ دُنیوی'' کے حامل تساہلانہ مزاج کو جوازِ نبوت فراہم کر سکیں۔ فی الحقیقت یہ ایک رہبانوی اور شاعرانہ خواص سے مغلوب مزاج ہے، جو کسی طرح بھی اسلام کے سماجی اُسوہ (Social Ideal) سے مطابقت نہیں رکھتا۔ علاوہ ازیں، قرآن کریم میں بیان کردہ صدیقین اور صالحین کے کردار کا تصور بھی اسلام کے متحرک (Dynamic) معاشرتی نظام کے تابع ہے، جو کبھی بھی سیرتِ طیبہؐ سے منحرف یا متصادم نہیں ہو سکتا۔ 6

یہاں اگلے مرحلے پر گفتگو مرزا صاحب کے اپنی ذات کے متعلق تصور (Self-Conception) پر ہو گی۔ اس سے ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ مرزا صاحب تخیل کے آئینے اپنی ذات اور مقام و مرتبہ کو کیسے دیکھتے ہیں۔ اُن کا اپنے بارے میں تشخص کیا ہے اور وہ اپنی تحریک کو ضرورت و اہمیت کے تناظر میں تاریخِ عالم میں کہاں رکھتے ہیں۔ کیا اُن میں خدا کے برگزیدہ بندوں کی طرح عجز و انکساری کی خوبیاں پائی جاتی ہیں، یا انا و تکبر سے بھرے ہوئے جذبات میں وہ بلا شرکتِ غیرے خود کو کمالاتِ روحانی اور جملہ اوصافِ انسانی سے مزین کر کے انسانیت کو خالقِ کائنات کی طرف سے عطا کردہ بلند ترین مرتبہ کے واحد دعویدار بن جاتے ہیں؟ موزوں رہے گا کہ اس بحث کا آغاز مرزا صاحب کے ایک شعر سے ہی کر دیا جائے۔ وہ اپنے بارے میں فرماتے ہیں:

روضہءِ آدم کہ تھا وہ نامکمل اب تلک

میرے آنے سے ہوا کامل بہ جملہ برگ و بار

اسی طرح وہ اپنے ایک فارسی شعر میں کچھ یوں گویا ہوتے ہیں:

زندہ شد ہر نبی بآمدنم

ہر رسُولے نہاں بہ پیرہنم

(ترجمہ: میری آمد سے ہر نبی زندہ ہوگیا۔ میرے لباس میں ہر رسُول پوشیدہ انداز میں موجود ہے۔)

مرزا صاحب کے اپنے متعلق عقیدہ کا نفسیاتی تجزیہ کرنے سے پہلے راقم الحروف مناسب مغیث ہے کہ معروف محقق اور کتبِ کثیرہ کے مصنف مولانا سید ابوالحسن ندوی کا اس صورتحال سے متعلق کیا گیا دلچسپ تبصرہ یہاں رقم کیا جائے۔ وہ رقمطراز ہیں:

''نبوت اور کمالاتِ نبوت کے بارے میں مرزا صاحب کا احساسِ برتری جو ایک خاص نفسیاتی کیفیت ہے اس قدر بڑھا ہوتھا کہ وہ اوّل تو اپنے کو تمام انبیاء کا ہم پلہ اور ہم چشم سمجھتے تھے۔۔۔

''پھر اس سے آگے بڑھ کر وہ اپنے آپ کو جامع کمالاتِ انبیاء سمجھتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اُن کا عقیدہ اور اعلان ہے کہ اُن سے نسلِ آدم کی تکمیل ہوئی ہے، اور اُن کے بغیر یہ گلشنِ انسانیت نا تمام تھا۔'' 7

واضح ہو کہ سید ابوالحسن ندوی کا یہ تبصرہ مذکورہ بالا اشعار کے حوالے سے ہے۔ یقیناً یہ بے حد موزوں اور جامع تبصرہ ہے، لیکن اس کے عنوان سے راقم الحروف کو اختلاف ہے، کیونکہ یہ مرزا صاحب کا احساسِ برتری ہر گز نہیں تھا جس کے زیرِ اثر اُنہوں نے ایسی خود پرستانہ باتیں کیں۔ بلکہ یہ ایک خاص نفسیاتی کیفیت ہے جس کی سائنسی توجیہات بھی موجود ہیں۔ اس کیفیت میں انسان خود کو لاشعوری طور پر دوسروں سے افضل و برتر متصنف شروع کر دیتا ہے۔ نفسیات کی زبان میں اس کیفیت کو ''نرگسیت'' (Narcissism) کہا جاتا ہے۔ نرگسیت ذہنی گڑ بڑ کا وہ ابتدائی مرحلہ ہے، جس میں فرد 'اپنی انا پر مرکوز ہو کر اپنی ہی ذات میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ خود پرستی اُسے اپنی ذات کا عاشق بنا دیتی ہے۔ یوں فرد دیوانہ وار اپنا ہی عاشق بن کر اور اپنے نفس کو آئینہ بنا کر اس میں اپنے جلوہ سے محظوظ ہوتا رہتا ہے۔۔۔ اس صورت میں جنسی کمزوریوں کے علاوہ جس قسم کی شخصیت معرضِ وجود میں آتی ہے، وہ خود پرست اور انانیت کی حامل ہوتی ہے۔ یہ لوگ خود کو ایک دیوتا کی مانند کسی بلند شہ نشین پر متمکن محسوس کرتے ہیں اور دوسروں سے 'عظمت' کا خراج وصول کرتے ہوئے جواب میں کچھ بھی دینے کو تیار نہیں ہوتے۔'' 8 نرگسیت کو شخصیت کے امراض کی نفسیاتی درجہ بندی، جسے DSM-IV-TR کا نام دیا گیا ہے، کے ''محورِ دوّم'' (Axis-II) کے ''گروہ۔ب'' (Cluster-B) میں شامل کیا گیا ہے۔ اس گروہ میں ہماری دلچسپی کے حوالے سے جو دوسرا اہم مرض نرگسیت کے ساتھ رکھا گیا ہے، وہ ''ہسٹریائی خرابی'' (Histrionic Disorder) ہے۔

اگر یہ معاملہ خود پرستی کی عادت سے بڑھ کر باقاعدہ ایک ''خبط'' (Delusion) کی شکل اختیار کر لے، تو اس کو اصطلاحاتِ نفسیات میں ''خبطِ عظمت'' (Delusion of Grandiose) کہتے ہیں۔ اِس کیفیت میں انسان اپنے آپ کو بادشاہ، ولی یا ہر دلعزیز سیاسی لیڈر مغیث ہے۔ بعض اوقات معاملہ یہاں تک بڑھ جاتا ہے، کہ نرگسیت و خبطِ عظمت کا شکار فرد اپنے آپ کو 'نبی' تک متصنف شروع کر دیتا ہے۔ اور ایسے خبط کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا انسان اپنے آپ کو دُنیا کی سب سے اہم ہستی سمجھ کر عالمِ انسانیت کے لیے اپنا وجود ناگزیر متصنف شروع کر دیتا ہے۔ یہ درحقیقت "Self-Centerism" کی انتہائی شکل ہوتی ہے۔ مرزا صاحب کے ''خبطِ عظمت'' کی ایک انتہائی زبردست مثال ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

''پس جیسا کہ میں نے بار بار بیان کر دیا ہے کہ یہ کلام جو میں سناتا ہوں، یہ قطعی اور یقینی طور پر خدا کا کلام ہے۔ جیسا کہ قرآن اور توریت خدا کا کلام ہے اور میں خدا کا ظلّی اور بروزی طور پر نبی ہوں اور ہر مسلمان کو دینی امور میں میری اطاعت واجب ہے اور ہر ایک جس کو میری تبلیغ پہنچ گئی ہے، گو وہ مسلمان ہے مگر مجھے اپنا حکم نہیں ٹھہراتا اور نہ مجھے مسیح موعود مانتا ہے اور نہ میری وحی کو خدا کی طرف سے جانتا ہے، وہ آسمان پر قابلِ مواخذہ ہے، کیونکہ جس امر کو اُس نے اپنے وقت پر قبول کرنا تھا رد کر دیا۔ میں صرف یہ نہیں کہتا کہ میں اگر جھوٹا ہوتا تو ہلاک کیا جاتا، بلکہ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور داؤدؑ اور آنحضرتؐ کی طرح میں سچا ہوں اور میری تصدیق کے لئے خدا نے دس ہزار سے زیادہ نشان دکھلائے ہیں۔ قرآن نے میری گواہی دی ہے۔ پہلے نبیوں نے میرے آنے کا زمانہ متعین کر دیا ہے کہ جو یہی زمانہ ہے اور میرے لئے آسمان نے بھی گواہی دی ہے اور زمین نے بھی، اور کوئی نبی نہیں جو میرے لئے گواہی نہیں دے چکا۔''

(تحفتہ الندوہ، صفحہ 4)

مرزا صاحب کی شخصیت کا تنقیدی اور نفسیاتی جائزہ لینے پر یہ معلوم ہوگا کہ مرزا صاحب میں متذکرہ بالا شخصیت کے امراض (Personality Disorders) کی یہ سب علامات بدرجہ اتم موجود ہیں اور وہ کسی بھی زاویہ سے ''نارمل انسان'' کہلوانے کے حقدار نہیں۔ کیونکہ ایک ایسا شخص جس کا اپنے بارے میں گمان یہ ہو کہ وہ نبی ہونے کی ساتھ ساتھ وہ ہستی بھی ہے، جس کی آمد کا اعلان دُنیا کے دو غالب ترین مذاہب اسلام اور عیسائیت دونوں ہی کر چکے ہیں۔ یہ موعودہ ہستی ''حضرت عیسیٰ مسیحؑ'' (Jesus Christ) ہیں، جنہیں قرآن پاک اُن کے تاریخی نام ''عیسیٰ ابن مریم'' سے یاد کرتا ہے۔ احادیث نبویؐ کی ایک کثیر تعداد کے مطابق وہ نہ صرف زندہ آسمان پر اُٹھائے گئے ہیں، بلکہ اُن کی دوبارہ آمد قُربِ قیامت میں ظہورِ دجال کے بعد شام کے شہر دمشق میں ہوگی۔ مسلم شریف کی ایک روایت کے مطابق اُن کے اُترنے کی جگہ دمشق کے مشرقی حصے میں ایک لقنار ہوگا، جہاں آپ دو زرد چادروں میں ملبوس آسمان سے زمین پر تشریف لائیں گے۔ پیغمبر اسلامؐ کے فرامین پر مبنی ذخیرۂ حدیث میں آمدہ معلومات کے علاوہ یہودی اور عیسائی صحائف بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ عہدِ قیامت (Apocalypse) کا حتمی میدانِ کارزار ''مشرقِ وُسطیٰ'' (Middle East) ہی بنے گا اور حضرت عیسیٰؑ کا نزول لازمی طور پر اسکے بالکل قریب ہوگا، کیونکہ یہی بات منطقی اور قرینِ قیاس ہے۔ احادیث کے مطابق آپؑ بنفسِ نفیس میدان میں نکلیں گے تاکہ دجال اور اسکے فتنہ کا عملاً خاتمہ کیا جاسکے اور یوں آپؑ اُن افواج کی مدد سے، جو آپؑ پر نہ صرف ایمان رکھتی ہوں گی بلکہ جن کی آپؑ نے آتے ہی کمان بھی سنبھال لی ہوگی، دجال اور اُس کی فتنہ پرور اور ظالم ''یہودی'' فوجوں کا خاتمہ کر دینگے۔ عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کا نزول بیت المقدس (یروشلم) میں ''کوہِ زیتون'' (Mount of Olives) پر ہوگا اور یہی وہ جگہ ہے جہاں سے آپ اپنی جنگی مہم کا آغاز کریں گے۔ 9

قربِ قیامت کے اس پورے منظر نامے، جس کی اُوپر درج کردہ جزوی تفصیلات اسلام اور یہودی و عیسائی مذہبی ادب سے ماخوذ ہیں، میں ''ہندوستان'' یا ''قادیان'' کا دُور دُور تک کہیں کوئی تذکرہ نظر نہیں آتا۔ تاہم مرزا صاحب اس بات پر بضد ہیں، کہ نزولِ مسیحؑ کے لئے ہندوستان سے زیادہ موزوں اور کوئی جگہ پورے الہامی منصوبہ میں کہیں نظر نہیں آتی۔ لہٰذا دو عظیم مذاہب کے اس مسیح کو ہندوستان کے اندر قادیان میں ہی نازل ہونا تھا۔ مرزا صاحب قادیان کے اس پُراسرار اعزاز کے حوالے سے خود کو ظہورِ مسیح کے عقیدہ تک ہی موقوف نہیں رکھتے، بلکہ وہ قرآنِ مجید میں سے بھی قادیان کا نام کشفی طور پر (انا انزلناہ قریبا من القادیان کی آواز سن کر) ڈھونڈ لیتے ہیں اور اس کو مکہ و مدینہ کے مماثل قرار دے کر دُنیا کا تیسرا مقدس ترین مقام قرار دیتے ہیں۔ 10 بقول مرزا صاحب کے ایک یہی جگہ شامی شہر دمشق کی روحانی تعبیر اور ظہورِ مسیح کے لئے مناسب ترین مقام ہے، جسے ہم صحیح مسلم کی ''لقنارہ شرقی'' والی حدیث کے بیان کی صحیح تعبیر و تشریح کہہ سکتے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر اس مقام کے امتیاز کی وجہ ماسوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ مرزا صاحب خود قادیان کے مکین تھے۔ حدیثِ مسلم کی اس مرزائی تشریح میں جو چیز سب سے زیادہ مضحکہ خیز ہے وہ خود لقنارہ شرقی ہے، جسے قادیانی ''منارہ شرقی'' لکھتے ہیں۔ یہ امر انتہائی دلچسپ ہے کہ فرمانِ رسول اللہ ﷺ کے مطابق دمشق کے مشرقی لقنار پر حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کا نزول ہونا ایک طے شدہ امر ہے، لیکن مرزا صاحب اپنے بحیثیتِ مسیح ''ظہور'' کے دعویٰ کے کم از کم 13 سال بعد 1902ء میں اُس لقنار کی بنیاد رکھ رہے ہیں جو کہ اُن کی مسیحی دینیات میں پہلے زینہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جبکہ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ لقنار جس پر مرزا صاحب کو نازل ہونا چاہیے تھا اُن کی زندگی میں مکمل تک نہ ہو سکا۔ لہٰذا یہاں بھی معاملہ علامتی تشریحات اور لمبی چوڑی تاویلات سے نپٹایا گیا۔ اپنے مقدمہ کی وکالت کرتے ہوئے مرزا صاحب اس حدیث کے بیان کے مطابق نزولِ عیسیٰؑ کے واقعہ کے حقیقی ہونے کا انکار کر دیتے ہیں اور بڑی بڑی تاویلیں دے کر یہ مؤقف اختیار کرتے ہیں کہ لقنار سے مراد ''اسلام کی عظمت'' ہے، اور جس لقنار کا سنگِ بنیاد اُنہوں نے حدیثِ مسلم کی روحانی تعبیر کے طور پر رکھا تھا، وہ لقنار اسلام کی عظمت و سربلندی کا ہمیشہ کے لئے عکاس رہے گا۔ یقیناً یہ اسلام مرزا صاحب کے نزدیک اُن کا اپنا لایا ہوا قادیانیت کا مذہب ہی تھا، جس کی سربلندی قادیان کے ''منارہ شرقی'' سے ظاہر ہونے کی پیش گوئی مرزا صاحب نے فرمائی تھی۔ تاہم معاملہ ایک صدی گزر جانے کے باوجود اُلٹا ہے، اور قادیانیت کا یہ لقنارِ عظمت اپنے وجود کے لئے بھی ایک ہندو

ریاست کا مرہونِ منت ہے۔ مزید برآں، قادیانی تحریک کی عمر بھی ایک صدی سے زائد ہو چکی ہے اور ابھی تک دُنیا کے کسی کونہ میں قادیانیت کو سربلندی حاصل نہیں ہو سکی، بلکہ دُنیا کی لگ بھگ 95% آبادی مرزا صاحب کی شخصیت، اُن کے پیغام کی نوعیت اور تحریک کے نام تک سے ناواقف ہے۔ اسی طرح جس ملک میں قادیانیت نے اپنی جڑیں مضبوط کر لی تھیں، اُس مملکت خداداد یعنی پاکستان کی مجالس قانون ساز نے بھی قادیانیوں کو ''کافر'' قرار دے کر نہ صرف قادیانی مذہب کی کمر توڑ دی ہے، بلکہ ختم نبوت کی واضح لفظوں میں تشریح کر کے اس پر ایمان لانے کو مسلمان ہونے کی شرط قرار دے کر ملکی آئین کا حصہ بنا دیا ہے۔

ہم چونکہ پیچھے گزر چکی بحث میں اس بات کے ثبوت مہیا کر کے ثابت کر چکے ہیں کہ مرزا صاحب اپنے متعلق ''خبطِ عظمت'' اور ''نرگسیت'' کے نفسیاتی عارضوں میں مبتلا تھے، اور اپنے مقام و مرتبہ کی بلندی کے لئے کسی بھی حیلہ بہانہ سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں خالصتاً مرزا صاحب کے اپنے الفاظ میں چند ایک اقتباسات بطورِ ثبوت یہاں پیش کئے جاتے ہیں، جن میں ''دمشق'' اور ''منارہ شرقی'' کے موضوعات کو زیرِ بحث لا کر کچھ ایسی تاویلاتی تشریحات کی گئی ہیں کہ انہیں پڑھ کر ایک اوسط درجے کے فہم و ادراک کا مالک مسلمان بھی اچنبھے کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں:

''یہ عاجز بھی اس بات (دمشق کی حقیقت) کی تفتیش کی طرف متوجہ نہیں ہوا کہ وہ معنی کیا ہیں کہ اسی اثناء میں میرے ایک دوست اور محبِ واثق مولوی حکیم نورالدین صاحب اس جگہ قادیان میں تشریف لائے اور اُنہوں نے اس بات کے لئے درخواست کی جو مسلم کی حدیث میں لفظِ دمشق و نیز اور چند ایسے مجمل الفاظ ہیں۔ ان کے انکشاف کے لئے جناب الٰہی میں توجہ کی جائے۔ چونکہ ان دنوں میں میری طبیعت علیل تھی اور دماغ ناقابل جدوجہد تھا، اس لئے میں ان تمام مقاصد کی طرف توجہ کرنے سے مجبور رہا۔ صرف تھوڑی سی توجہ کرنے سے ایک لفظ کی تشریح یعنی دمشق کے لفظ کی حقیقت میرے پر کھل گئی۔''

''پس واضح ہو کہ دمشق کے لفظ کی تاویل میں میرے پر من جانب اللہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جگہ ایسے قصبہ کا نام دمشق رکھا گیا ہے جس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو یزیدی الطبع اور یزید پلید کی عادات و خیالات کے پیرو ہیں، جن کے دلوں میں اللہ اور رسول کی کچھ محبت اور احکامِ الٰہی کی کچھ عظمت نہیں، جنھوں نے اپنی خواہشوں کو معمول بنا رکھا ہے۔۔۔ اور کیونکہ طبیب کو بیماروں کی طرف آنا چاہیے اس لئے ضرور تھا کہ مسیح ایسے ہی لوگوں میں نازل ہو۔'' 11

مرزا صاحب اسی پیرائے میں مزید فرماتے ہیں:

''تب اُس نے مجھ سے کہا کہ یہ لوگ یزیدی الطبع ہیں اور یہ قصبہ (یعنی قادیان) دمشق کے مشابہ ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے ایک بڑے کام کے لئے اس دمشق میں اس عاجز کو اُتارا۔'' 12

حیران کن امر یہ ہے کہ مرزا صاحب کی تاویلاتی تشنگی بجائے اس کے کہ ہر تشریح کے ساتھ کم ہو، بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور اب ''مثیلِ مسیح و مشابہ حُسین'' کی تاویل محض اس لئے اُن کے قلم سے نمودار ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی شخصیت کو مجموعہ کمالات و صفات ثابت کر سکیں اور لوگوں میں اُن کی ''اُلوہی مسیحیت'' کی اشاعت میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

''پس مسیح کا دمشق میں اُترنا صاف دلالت کرتا ہے کہ کوئی مثیلِ مسیح جو حُسین سے بھی بوجہ مشابہت ان دونوں بزرگوں کی مماثلت رکھتا ہے، یزیدیوں کی تنبیہ اور ملزم کرنے کے لئے جو مثیل یہود ہیں اُترے گا۔'' 13

مرزا صاحب کے ''مراق'' کا قضیہ سلجھانا ابھی باقی ہے۔ مرزا صاحب کے اپنے بیان کے مطابق اُن کو ہسٹریا اور مراق دونوں بیماریاں تھیں۔ انہوں نے مراق کو اپنے ''اوپر کے دھڑ'' کی زرد چادر کا نام دے کر اس دماغی مرض کو بھی، بقول اُن کے، مسیح موعود کی پہلے سے بیان کردہ علامات میں سے ایک علامت قرار دے دیا۔ مراق 'مالیخولیا' (Melancholia) کی ایک قسم ہے، جس میں فرد کے افکار اور اظہار کا دائرہ مبالغہ کی حد تک بڑا ہو جاتا ہے اور وہ چیزوں کو اُن کی اصل سے کافی بڑھا کر پیش کرتا ہے۔ مبالغہ کرنا مراق کے مریض کی عادت بن جاتا ہے اور اُس کو محسوس تک نہیں ہوتا کہ وہ مبالغہ

آرائی کررہا ہے۔تاہم اس مبالغہ کے پیچھے ایک چیز جو مریض کے شعور میں ہمیشہ موجود ہوتی ہے وہ اپنی ذات کی بڑائی کے ذریعے ''انا کی تسکین'' کا حصول ہے۔مزید برآں، کوئی نامعلوم خوف مریض کو گھیرے رکھتا ہے، اور اُس کی طبیعت میں بلاوجہ کا اضطراب رہنے لگتا ہے، جس سے اُس کے سوچنے کی حس بھیشدید متاثر ہوتی ہے۔ مراق کے مرض کے حوالے سے ایک معروف قادیانی ماہر طب ''ڈاکٹر شاہنواز'' کی تحقیق مرزا صاحب کے ایسے پیروکاران کے لئے کافی حیران کن ہوگی جو اہلِ عقل ہیں اور عقائد کے بتوں کو توڑ کر بیرونی حقائق کے مطابق تبدیلی کو قبول کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ:

''ایک مدعی الہام کے متعلق اگر یہ ثابت ہوجائے کہ اس کو ہسٹریا، مالیخولیا، مرگی کا مرض تھا تو اس کے دعوے کی تردید کے لئے پھر کسی اور ضرب کی ضرورت نہیں رہتی، کیونکہ یہ ایسی چوٹ ہے جو اُس کی صداقت کی عمارت کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتی ہے۔''14

الغرض اگر مذکورہ بالا تمام علامات کو قدرے بڑے پیمانے پر ایک مکمل نفسیاتی مرض کے عنوان کے ذیل میں درج کیا جائے، اور اسے ایک اجتماعی نام دینے کی کوشش کی جائے، تو اس مرض کا جو نام جدید نفسیات کی زبان میں ہوگا وہ ''شیزوفرینیا' (Schezophrenia) ہے۔ایک تفصیلی ''نفسیاتی جائزہ'' کے بعد اس امر کو ماننے میں شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی کی مرزا صاحب کی ذات شیزوفرینیا کے مرض کی وہ تاریخی صورت ہے جس پر کبھی غور ہی نہیں کیا گیا۔ایسا لگتا ہے کہ عصرحاضر میں شیزوفرینیا پر کی جانے والی سبھی تحقیقات میں صرف جدید انسان کے رویوں کو ہی زیرِ غور لایا گیا ہے، اور ماضی کے انسان کے رویوں کو کبھی شیزوفرینیا سے متعلق نفسیاتی تحقیقات کی کسوٹی پر لانے کی دانستہ طور پر کوشش نہیں کی گئی۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جو نفسیاتی امراض آج موجود ہیں، وہ پہلے زمانوں میں نہ ہوں؟ انسان کے نفسیاتی رویے کبھی یکسر تبدیل نہیں ہوسکتے۔لہٰذا شیزوفرینیا کے مرض کی بیسویں صدی میں دریافت کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ اس مرض کا اُنیسویں صدی میں کوئی وجود نہیں تھا۔

مرزا صاحب کے رویوں اور رجحانات میں شیزوفرینیا کی شناخت ہوجانے کے بعد اگر اس موضوع پر جامع تحقیقات کی جائیں، تو حقائق کے ایسے نئے باب کھلیں گے کہ خود مرزا صاحب کی اقتداء کرنے والے لوگ دنگ رہ جائیں گے۔تاہم ایسی صورت میں ایک فائدہ جو مرزا صاحب کو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اس بات کا امکان کلیتہً رد نہیں کر سکتے کہ مرزا صاحب موصوف الہام گوئی کے معاملہ میں سو فیصد جھوٹ نہ بولتے ہوں، بلکہ لفاظی (Rhetoric) اور غلو (Exaggeration) کے حربوں کے درمیان کہیں ایسا سچ موجود ہو، کہ جس کا مرزا صاحب نے مشاہدہ یا نظارہ ضرور کیا ہو اور اُنہیں کوئی آواز سنائی دی ہو۔کیونکہ شیزوفرینیا کے مریضوں میں سب سے زیادہ عمومی علامات یہی ہیں۔

حوالہ جات

1۔محمدی بیگم سے شادی والی پیشگوئی کو مرزا صاحب نے اپنی نبوت کی صداقت کا معیار قرار دیا تھا،لیکن یہ پیشگوئی کبھی پوری نہ ہوسکی اور مرزا صاحب کو خود بھی اس بات کا اعتراف تھا، تاہم تاویلات نے معاملہ دبائے رکھا۔

2۔تبلیغ رسالت، جلد7،صفحہ 19

3۔مولانا سید ابوالحسن ندوی، قادیانیت: مطالعہ و جائزہ، کراچی، مجلس نشریاتِ اسلام، صفحہ 20

4۔مرزا بشیر احمد، سیرت المہدی، جلد2، صفحہ 55

5۔مولانا دوست محمد شاہد، سوانح حضرت مسیح موعود، صفحہ 4

6۔قارئین کرام! مندرجہ بالا تحریر میں مرزا صاحب کا حضور نبی ء کریم ﷺ سے موازنہ ہرگز مقصود نہیں، اور نہ ہی کوئی راسخ العقیدہ مسلمان ایسا سوچ سکتا ہے۔ چونکہ ہماری اس تحریر کے مخاطب مرزا صاحب کے پیروکاران بھی ہیں، اس لئے حضورؐ کے کردار کے چند گوشے جو کہ آپؐ کی اعلانِ نبوت سے پہلے کی زندگی سے متعلق ہیں، کا اتمامِ حجت کے لئے یہاں پیش کیا جانا ضروری تھا۔ یہ تاریخی واقعات مرزا صاحب کی زندگی کے سبھی گوشے تنقیداً پرکھنے کے لئے معیارِ اولیٰ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مزید میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ محض ایک معاملے میں ہی نہیں، بلکہ مقام ومنہاجِ نبوت کے سبھی پہلوؤں کے احاطے کے لئے ''حتمی معیار'' (Archetype Standard) کی حیثیت رکھتی ہے۔ جبکہ مرزا صاحب کی زندگی اس کے برعکس ایک عام صالح مسلمان کی زندگی سے بھی مشابہت نہیں رکھتی!

7۔مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، قادیانیت: مطالعہ اور جائزہ، صفحہ 89-88

8۔ڈاکٹر سلیم اختر، تین بڑے نفسیات دان، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، طبع 1999، صفحہ 83

9۔

Stephen Flurry, *History and Prophecy of Middle East*, OK: Philadelphia Church of God, 2004, P.16

10۔ازالہ اوہام، 1:40، روحانی خزائن، 3:40

11۔ازالہ اوہام، صفحہ 33-32، نیز حاشیہ صفحہ 34-33

12۔حاشیہ ازالہ اوہام صفحہ 68

13۔حاشیہ ازالہ اوہام صفحہ 34

14۔ڈاکٹر شاہنواز قادیانی، مضمون از ڈاکٹر شاہنواز ''ریویو آف ریلیجنز'' میگزین، قادیان، اگست 1926